(۱۹)

نام

اس سورت کا نام آیت وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ سے ماخوذ ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں حضرت مریمؑ کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزُول

اس کا زمانۂ نزول ہجرتِ حبشہ سے پہلے کا ہے۔ معتبر رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین اسلام جب نجاشی کے دربار میں بلائے گئے تھے، اس وقت حضرت جعفرؓ نے یہی سورت بھرے دربار میں تلاوت کی تھی۔

تاریخی پس منظر

جس دَور میں یہ سورہ نازل ہوئی، اس کے حالات کی طرف ہم کسی حد تک سورۂ کہف کے دیباچے میں اشارہ کر چکے ہیں۔ لیکن وہ مختصر اشارہ اِس سورہ کو اور اس دَور کی دوسری سورتوں کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے ہم ذرا اُس وقت کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

قریش کے سردار جب تضحیک، اِستہزاء، اِطماع، تخویف اور جھوٹے الزامات کی تشہیر سے تحریکِ اسلامی کو دبانے میں ناکام ہو گئے، تو انھوں نے ظلم وستم، مار پیٹ اور مَعاشی دباؤ کے ہتھیار استعمال کرنے شروع کیے۔ ہر قبیلے کے لوگوں نے اپنے قبیلے کے نومسلموں کو تنگ پکڑا اور طرح طرح سے ستا کر، قید کر کے، بھوک پیاس کی تکلیفیں دے کر، حتّٰی کہ سخت جسمانی اذیتیں دے دے کر انھیں اسلام چھوڑنے پر مجبُور کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں خُصوصیت کے ساتھ غریب لوگ اور وہ غلام اور مَوالی، جو قریش والوں کے تحت زیردست کی حیثیت سے رہتے تھے، بُری طرح پیسے گئے۔ مثلاً بلالؓ، عامرؓ بن فُہیرہ، اُم عُبَیسؓ، زِنّیرۃؓ، عَمّارؓ بن یاسرؓ اور ان کے والدین وغیرہم۔ ان لوگوں کو مار مار کر اَدھ مُوا کر دیا جاتا، بھوکا پیاسا بند رکھا جاتا، مکے کی تپتی ہوئی ریت پر چلچلاتی دُھوپ میں لٹا دیا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ کر گھنٹوں تڑپایا جاتا۔ جو لوگ پیشہ ور تھے، ان سے کام لیا جاتا اور اُجرت ادا کرنے میں پریشان کیا جاتا۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت خَبّابؓ بن اَرَتؓ کی یہ رِوایت موجود ہے کہ:

”میں مکے میں لوہار کا کام کرتا تھا، مجھ سے عاص بن وائل نے کام لیا، پھر جب میں اس سے اُجرت لینے گیا تو اس نے کہا کہ میں تیری اُجرت نہ دوں گا جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے۔“

اسی طرح جو لوگ تجارت کرتے تھے، ان کے کاروبار کو برباد کرنے کی کوششیں کی جاتیں، اور جو معاشرے میں کچھ عزت کا مقام رکھتے تھے، ان کو ہر طریقے سے ذلیل و رُسوا کیا جاتا۔ اسی زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت خَبّابؓ کہتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے سایے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپؐ خدا سے دعا نہیں فرماتے؟'' یہ سن کر آپؐ کا چہرۂ مبارک تمتما اُٹھا اور آپؐ نے فرمایا: ''تم سے پہلے جو اہلِ ایمان تھے، اُن پر اس سے زیادہ مظالم ہو چکے ہیں۔ ان کی ہڈیوں پر لوہے کی کنگھیاں گھِسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر رکھ کر آرے چلائے جاتے تھے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا، یہاں تک کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ ایک آدمی صَنعا سے حَضرَموت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہو گا، مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔'' (بخاری)

یہ حالات جب ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ عام الفیل (۵ نبوی) میں حضورؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ لوخرجتم الٰی ارض الحبشة فان بها ملكًا لا يُظلَم عنده احد وهي ارض صدق حتي يجعل الله لكم فرجًا مما انتم فيه۔ ''اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ جب تک اللہ تمھاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا کرے، تم لوگ وہاں ٹھیرے رہو۔''

اس ارشاد کی بنا پر پہلے گیارہ مَردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی۔ قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا، مگر خوش قسمتی سے شُعَیبَہ کے بندرگاہ پر اُن کو بروقت حَبَش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ پھر چند مہینوں کے اندر مزید لوگوں نے ہجرت کی، یہاں تک کہ ۸۳ مرد، ۱۱ عورتیں اور ۷ غیر قریشی مسلمان حبش میں جمع ہو گئے، اور مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ۴۰ آدمی رہ گئے۔

اِس ہجرت سے مکے کے گھر گھر میں کُہرام مچ گیا، کیونکہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل نہ ہوں۔ کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد، کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن۔ ابوجہل کے بھائی سَلَمہ بن ہِشَام، اس کے چچازاد بھائی ہِشَام بن ابی حُذَیفہ اور عَیّاش بن ابی ربیعہ اور اس کی چچازاد بہن حضرت اُمِّ سَلَمَہ، ابوسفیان کی بیٹی اُمِّ حبیبہ، عُتبہ کے بیٹے اور ہند جگر خوار کے سگے بھائی ابو حُذَیفَہ، سُہَیل بن عَمرو کی بیٹی سَہلہ، اور اسی طرح دوسرے سردارانِ قریش اور مشہور دشمنانِ اسلام کے اپنے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔

اسی لیے کوئی گھر نہ تھا جو اس واقعے سے متأثر نہ ہُوا ہو۔ بعض لوگ اس کی وجہ سے اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سخت ہوگئے، اور بعض کے دلوں پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ آخرِکار وہ مسلمان ہو کر رہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اسلام دشمنی پر پہلی چوٹ اسی واقعے سے لگی۔ ان کی ایک قریبی رشتہ دار لیلیٰؓ بنت حَثْمہ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کے لیے اپنا سامان باندھ رہی تھی، اور میرے شوہر عامرؓ بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمرؓ آئے اور کھڑے ہو کر میری مشغولیت کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد کہنے لگے: ''عبداللہ کی ماں! جا رہی ہو؟'' میں نے کہا: ''ہاں، خدا کی قسم! تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا۔ خدا کی زمین کُھلی پڑی ہے، اب ہم کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں خدا ہمیں چین دے۔'' یہ سن کر عمرؓ کے چہرے پر رِقّت کے ایسے آثار طاری ہوئے جو میں نے کبھی ان پر نہ دیکھے تھے، اور وہ بس یہ کہہ کر نکل گئے کہ ''خدا تمھارے ساتھ ہو۔''

ہجرت کے بعد قریش کے سردار سر جوڑ کر بیٹھے اور انھوں نے طے کیا کہ عبداللہ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) اور عَمْرو بن عاص کو بہت سے قیمتی تحائف کے ساتھ حبش بھیجا جائے اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح نَجاشی کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ان مہاجرین کو مکہ واپس بھیج دے۔ اُمُّ المومنین حضرت اُمِّ سَلَمہؓ نے (جو خود مہاجرینِ حبشہ میں شامل تھیں) یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے یہ دونوں ماہرِ سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حبش پہنچے۔ پہلے انھوں نے نجاشی کے اَعیانِ سلطنت میں خوب ہدیے تقسیم کر کے سب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے نجاشی پر بالاتفاق زور دیں گے۔ پھر نجاشی سے ملے اور اس کو بیش قیمت نذرانہ دینے کے بعد کہا کہ ''ہمارے شہر کے چند نادان لونڈے بھاگ کر آپ کے ہاں آگئے ہیں، اور قوم کے اشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ لڑکے ہمارے دین سے نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، بلکہ انھوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے۔'' ان کا کلام ختم ہوتے ہی اہلِ دربار ہر طرف سے بولنے لگے کہ ''ایسے لوگوں کو ضرور واپس کر دینا چاہیے، ان کی قوم کے لوگ زیادہ جانتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے۔ انھیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔'' مگر نجاشی نے بگڑ کر کہا کہ ''اس طرح تو میں انھیں حوالے نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے دوسرے ملک کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا اور یہاں پناہ لینے کے لیے آئے، ان سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ پہلے میں انھیں بُلا کر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے۔'' چنانچہ نجاشی نے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دربار میں بلا بھیجا۔

نجاشی کا پیغام پا کر سب مہاجرین جمع ہوئے اور انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے۔ آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے، ہم تو

وہی بے کم و کاست پیش کریں گے، خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے۔ دربار میں پہنچے تو چھوٹتے ہی نجاشی نے سوال کیا کہ "یہ تم لوگوں نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑا اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہوئے، نہ دُنیا کے دوسرے اَدیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا؟ آخر یہ تمھارا نیا دین ہے کیا؟" اس پر مہاجرین کی طرف سے جعفرؓ بن ابی طالب نے ایک برجستہ تقریر کی، جس میں پہلے عربِ جاہلیّت کی دینی، اَخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بِعثَت کا ذکر کر کے بتایا کہ آپؐ کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں، پھر اُن مظالم کا ذکر کیا جو آنحضورؐ کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھا رہے تھے، اور اپنا کلام اس بات پر ختم کیا کہ دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک کا رُخ اس اُمید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔ نجاشی نے یہ تقریر سن کر کہا کہ "ذرا مجھے وہ کلام تو سناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے تمھارے نبی پر اُترا ہے۔" حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورۂ مریم کا وہ ابتدائی حصّہ سنایا جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سنتا رہا اور روتا رہا، یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہو گئی۔ جب حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ "یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں، خدا کی قسم! میں تمھیں ان لوگوں کے حوالے نہ کروں گا۔"

دوسرے روز عَمرو بن العاص نے نجاشی سے کہا کہ "ذرا ان لوگوں سے بلا کر یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰ بن مریمؑ کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے۔ یہ لوگ ان کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں۔ نجاشی نے پھر مہاجرین کو بلا بھیجا۔ مہاجرین کو پہلے سے عَمرو کی چال کا علم ہو چکا تھا۔ انھوں نے جمع ہو کر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دو گے؟ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے پریشان تھے۔ مگر پھر بھی اصحابِ رسول اللہ نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہوتا ہے ہو جائے، ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمائی اور اللہ کے رسولؐ نے سکھائی۔ چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں گئے اور نجاشی نے عَمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال ان کے سامنے دُہرایا تو جعفرؓ بن ابی طالب نے اُٹھ کر بلا تأمّل کہا کہ هو عبدُاللّٰه ورسوله وروحُهٗ وكلمتهٗ القاها الٰى مريَمَ العذراء البتول "وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک روح اور ایک کَلِمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا۔" نجاشی نے سن کر ایک تنکا زمین سے اُٹھایا اور کہا: "خدا کی قسم! جو کچھ تم نے کہا ہے، عیسیٰؑ اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے۔" اس کے بعد نجاشی نے قریش کے بھیجے ہوئے تمام ہدیے یہ کہہ کر واپس کر دیے کہ میں رشوت نہیں لیتا، اور مہاجرین سے کہا کہ تم بالکل اطمینان کے ساتھ رہو۔

موضوع اور مضمون اس تاریخی پَسِ منظر کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم اس سورہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں اوّلین بات نمایاں ہو کر ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزیں گروہ کی حیثیت سے

اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا رہے تھے، مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے معاملے میں ذرّہ برابر مداہنت کرنے کی تعلیم نہ دی، بلکہ چلتے وقت زادِراہ کے طور پر یہ سورہ ان کے ساتھ کی، تاکہ عیسائیوں کے ملک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور ان کے ابن اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کر دیں۔

پہلے دو رُکوعوں میں حضرت یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کا قصّہ سنانے کے بعد پھر تیسرے رکوع میں حالاتِ زمانہ کی مناسبت سے حضرت ابراہیمؑ کا قصّہ سنایا گیا ہے، کیونکہ ایسے ہی حالات میں وہ بھی اپنے باپ اور خاندان اور اہلِ ملک کے ظلم سے تنگ آ کر وطن سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس سے ایک طرف کفارِ مکّہ کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ آج ہجرت کرنے والے مسلمان ابراہیمؑ کی پوزیشن میں ہیں، اور تم لوگ اُن ظالموں کی پوزیشن میں ہو جنھوں نے تمھارے باپ اور پیشوا ابراہیم علیہ السلام کو گھر سے نکالا تھا۔ دوسری طرف مہاجرین کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام وطن سے نکل کر تباہ نہ ہوئے بلکہ اور زیادہ سربلند ہو گئے، ایسا ہی انجامِ نیک تمھارا انتظار کر رہا ہے۔

اس کے بعد چوتھے رُکوع میں دوسرے انبیاؑ کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام وہی دین لے کر آئے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، مگر انبیاؑ کے گزر جانے کے بعد ان کی اُمّتیں بگڑتی رہی ہیں، اور آج مختلف اُمتوں میں جو گمراہیاں پائی جا رہی ہیں، یہ اسی بگاڑ کا نتیجہ ہیں۔

آخری دو رُکوعوں میں کفارِ مکہ کی گمراہیوں پر سخت تنقید کی گئی ہے اور کلام ختم کرتے ہوئے اہلِ ایمان کو مُژدہ سنایا گیا ہے کہ دُشمنانِ حق کی ساری کوششوں کے باوجود بالآخر تم محبُوبِ خلائق ہو کر رہو گے۔

سُوْرَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ

آیاتہا ۹۸ رکوعاتہا ۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
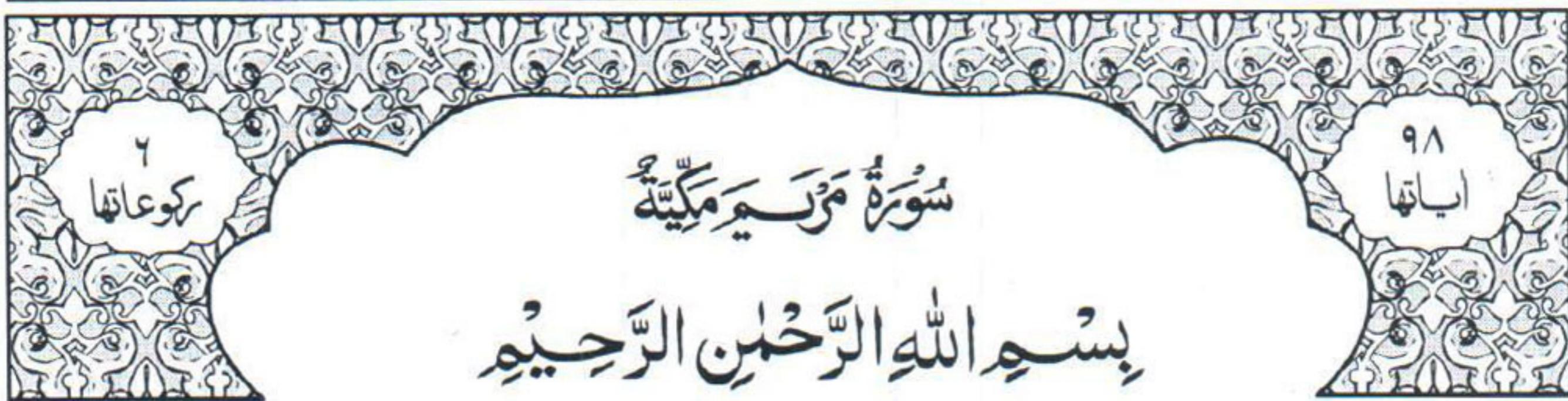
كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿۱﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿۲﴾ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ

ک، ہ، ی، ع، ص۔ ذکر[1] ہے اُس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زَکَرِیّا[2] پر کی تھی، جب کہ اُس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔

اُس نے عرض کیا: ”اے پروردگار! میری ہڈیاں تک گُھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اُٹھا ہے۔ اے پروردگار! میں کبھی تجھ سے دُعا مانگ کر نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں کی

۱- تقابُل کے لیے سورۂ آلِ عمران، رکوع ۴ پیشِ نظر رہے جس میں یہ قصّہ دوسرے الفاظ میں بیان ہو چکا ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد ۱، ص ۲۴۶-۲۵۰)

۲- یہ حضرت زکریّاؑ جن کا ذکر یہاں ہو رہا ہے، حضرت ہارونؑ کے خاندان سے تھے۔ ان کی پوزیشن ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کے نظامِ کہانت (priesthood) کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ فلسطین پر قابض ہونے کے بعد بنی اسرائیل نے ملک کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ حضرت یعقوبؑ کی اولاد کے ۱۲ قبیلوں میں تو سارا ملک تقسیم کر دیا گیا، اور تیرھواں قبیلہ (یعنی لاوِی بن یعقوبؑ کا گھرانا) مذہبی خدمات کے لیے مخصوص رہا۔ پھر بنی لاوی میں سے بھی اصل وہ خاندان جو ”مَقدِس میں خداوند کے آگے بخور جلانے کی خدمت“ اور ”پاک ترین چیزوں کی تقدیس کا کام“ کرتا تھا، حضرت ہارونؑ کا خاندان تھا۔ باقی دوسرے بنی لاوِی مَقدِس کے اندر نہیں جا سکتے تھے، بلکہ خداوند کے گھر کی خدمت کے وقت صحنوں اور کوٹھڑیوں میں کام کرتے تھے، سَبت کے دن اور عیدوں کے موقع پر سوختنی قربانیاں چڑھاتے تھے، اور مَقدِس کی نگرانی میں بنی ہارون کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

بنی ہارون کے چوبیس خاندان تھے جو باری باری سے مَقدِس کی خدمت کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ انھی خاندانوں میں سے ایک اَبِیّاہ کا خاندان تھا جس کے سردار حضرت زکریّاؑ تھے۔ اپنے خاندان کی باری کے دنوں میں یہی مَقدِس میں جاتے اور خداوند کے حضور بخور جلانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ (تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: بائبل کی کتابِ تواریخ

مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝٥ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝٦ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝٧ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝٨ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْــًٔا ۝٩ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ

بُرائیوں کا خوف ہے[۳]، اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو مجھے اپنے فضلِ خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آلِ یعقوبؑ کی میراث بھی پائے[۴]، اور اے پروردگار! اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا۔"

(جواب دیا گیا:) "اے زکریاؑ! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰؑ ہو گا۔ ہم نے اِس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا[۵]۔"

عرض کیا: "پروردگار! بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہو گا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سُوکھ چکا ہوں؟"

جواب ملا: "ایسا ہی ہو گا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے، آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا[۶]۔"

زکریاؑ نے کہا: "پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔"

اوّل، باب ۲۳ و ۲۴)

۳- مطلب یہ ہے کہ اَبیّاہ کے خاندان میں میرے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو دینی اور اَخلاقی حیثیت سے اس منصب کا اہل ہو جسے مَیں سنبھالے ہوئے ہوں۔ آگے جو نسل اُٹھتی نظر آ رہی ہے، اس کے لچھن بگڑے ہوئے ہیں۔

۴- یعنی مجھے صرف اپنی ذات ہی کا وارث مطلوب نہیں ہے بلکہ خانوادۂ یعقوبؑ کی بھلائیوں کا وارث مطلوب ہے۔

۵- لُوقا کی انجیل میں الفاظ یہ ہیں: "تیرے کُنبے میں کسی کا یہ نام نہیں۔" (۱:۶۱)

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿۱۰﴾ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾

فرمایا: ”تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے۔“

چنانچہ وہ محراب[۷] سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح و شام تسبیح کرو۔[۸]

۶ – حضرت زکریاؑ کے اس سوال اور فرشتے کے جواب کو نگاہ میں رکھیے، کیونکہ آگے چل کر حضرت مریمؑ کے قصّے میں پھر یہی مضمون آ رہا ہے، اور اس کا جو مفہوم یہاں ہے وہی وہاں بھی ہونا چاہیے۔ حضرت زکریاؑ نے کہا کہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے، میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے۔ فرشتے نے جواب دیا کہ ”ایسا ہی ہوگا“، یعنی تیرے بڑھاپے اور تیری بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود تیرے ہاں لڑکا ہوگا۔ اور پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حوالہ دیا کہ جس خدا نے تجھے نیست سے ہست کیا، اُس کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ تجھ جیسے شیخِ فانی سے ایک ایسی عورت کے ہاں اولاد پیدا کر دے جو عمر بھر بانجھ رہی ہے۔

۷ – محراب کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۳۶۔

۸ – اس واقعے کی جو تفصیلات لوقا کی انجیل میں بیان ہوئی ہیں انھیں ہم یہاں نقل کر دیتے ہیں، تاکہ لوگوں کے سامنے قرآن کی رِوایَت کے ساتھ مسیحی روایت بھی رہے۔ درمیان میں قوسین کی عبارتیں ہماری اپنی ہیں:

”یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۹) اَبیّاہ کے فریق میں سے زکریاہ نام کا ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارونؑ کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام اَلیشبَع (Elizabeth) تھا۔ اور وہ دونوں خدا کے حضور راست باز اور خداوند کے سب احکام و قوانین پر بے عیب چلنے والے تھے۔ اور ان کے اولاد نہ تھی، کیونکہ اَلیشبَع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے۔ جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے مُوافق اس کے نام کا قرعہ نکلا، کہ خداوند کے مَقدِس میں جا کر خوشبو جلائے۔ اور لوگوں کی ساری جماعت خوشبو جلاتے وقت باہر دعا کر رہی تھی، کہ خداوند کا فرشتہ خوشبو کے مَذبَح کی داہنی طرف کھڑا ہوا اُس کو دکھائی دیا۔ اور زکریاہ دیکھ کر گھبرایا اور اس پر دہشت چھا گئی۔ مگر فرشتے نے اس سے کہا: اے زکریاہ! خوف نہ کر، کیونکہ تیری دُعا سن لی گئی (حضرت زکریاؑ کی دعا کا ذکر بائبل میں کہیں نہیں ہے) اور تیرے لیے تیری بیوی اَلیشبَع کے بیٹا ہوگا۔ تُو اس کا نام یُوحنّا (یعنی یحییٰ) رکھنا، اور تجھے خوشی و خُرّمی ہوگی، اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب سے خوش ہوں گے، کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝١٢ۙ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا

"اے یحییٰؑ! کتابِ الٰہی کو مضبوط تھام [9] لے۔"

ہم نے اسے بچپن ہی میں "حکم" [10] سے نوازا، اور اپنی طرف سے اس کو نرم دلی [11]

ہوگا (سورۂ آلِ عمران میں اس کے لیے لفظ سَیِّدًا استعمال ہوا ہے)، ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیے گا (تَقِيًّا)، اور اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القُدس سے بھر جائے گا (وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا)، اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف، جو اُن کا خدا ہے، پھیرے گا۔ اور وہ ایلیاؔہ (الیاس علیہ السلام) کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راست بازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لیے ایک مستعد قوم تیار کرے۔"

"زکریاہ نے فرشتے سے کہا: "میں اس بات کو کس طرح جانوں؟ کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے۔" فرشتے نے جواب میں اس سے کہا: "میں جبرائیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں، اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے اِن باتوں کی خوش خبری دوں۔ اور دیکھ، جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہو لیں، تو چُپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا، اس لیے کہ تو نے میری باتوں کا، جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی، یقین نہ کیا۔ (یہ بیان قرآن سے مختلف ہے۔ قرآن اسے نشانی قرار دیتا ہے، اور لُوقا کی روایت اسے سزا کہتی ہے۔ نیز قرآن صرف تین دن کی خاموشی کا ذکر کرتا ہے، اور لوقا کہتا ہے کہ اس وقت سے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش تک حضرت زکریاؑ گونگے رہے۔) اور لوگ زکریاہ کی راہ دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ اسے مَقدِس میں کیوں دیر لگی۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انھوں نے معلوم کیا کہ اس نے مَقدِس میں رُؤیا دیکھی ہے، اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا۔" (لُوقا، باب ۱، آیت ۵ تا ۲۲)

۹ – بیچ میں یہ تفصیل چھوڑ دی گئی ہے کہ اس فرمانِ الٰہی کے مطابق حضرت یحییٰؑ پیدا ہوئے اور جوانی کی عمر کو پہنچے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب وہ سِنّ رُشد کو پہنچے تو کیا کام اُن سے لیا گیا۔ یہاں صرف ایک فقرے میں اس مشن کو بیان کر دیا گیا ہے جو منصبِ نبوت پر مامور کرتے وقت ان کے سُپرد کیا گیا تھا۔ یعنی وہ تورات پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہوں اور بنی اسرائیل کو اس پر قائم کرنے کی کوشش کریں۔

۱۰ – "حکم"، یعنی قوتِ فیصلہ، قوتِ اجتہاد، تفقہ فی الدین، معاملات میں صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت، اور اللہ کی طرف سے معاملات میں فیصلہ دینے کا اختیار۔

۱۱ – اصل میں لفظ حَنَان استعمال ہوا ہے جو قریب قریب مامتا کا ہم معنیٰ ہے۔ یعنی ایک ماں کو جو غایت درجے

وَّزَکٰوۃً ؕ وَکَانَ تَقِیًّا ۙ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَیۡہِ وَلَمۡ یَکُنۡ جَبَّارًا عَصِیًّا ﴿۱۴﴾
وَسَلٰمٌ عَلَیۡہِ یَوۡمَ وُلِدَ وَیَوۡمَ یَمُوۡتُ وَیَوۡمَ یُبۡعَثُ حَیًّا ﴿۱۵﴾ ع

وقف لازم ع ۱۵

اور پاکیزگی عطا کی، اور وہ بڑا پرہیزگار اور اپنے والدین کا حق شناس تھا۔ وہ جبّار نہ تھا اور نہ نافرمان۔
سلام اُس پر جس روز کہ وہ پیدا ہوا، اور جس دن وہ مرے، اور جس روز وہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے[12] ع

کی شفقت اپنی اولاد پر ہوتی ہے، جس کی بنا پر وہ بچے کی تکلیف پر تڑپ اُٹھتی ہے، وہ شفقت حضرت یحییٰؑ کے دل میں بندگانِ خدا کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

۱۲ – حضرت یحییٰؑ کے جو حالات مختلف انجیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں، انھیں جمع کر کے ہم یہاں ان کی سیرتِ پاک کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں، جس سے سورۂ آلِ عمران اور اس سورہ کے مختصر اشارات کی توضیح ہو گی۔

لوقا کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ سے ۶ مہینے بڑے تھے۔ ان کی والدہ اور حضرت عیسیٰؑ کی والدہ آپس میں قریبی رشتہ دار تھیں۔ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ نبوت کے منصب پر عملاً مامور ہوئے، اور یُوحنّا کی روایت کے مطابق انھوں نے شرقِ اُرْدُن کے علاقے میں دعوت الی اللہ کا کام شروع کیا۔ وہ کہتے تھے:

"میں، جیسا یَسْعِیاہ نبی نے کہا ہے، بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔" (یُوحنّا ۱: ۲۳)

مَرقُس کا بیان ہے کہ وہ لوگوں سے گناہوں کی توبہ کراتے تھے اور توبہ کرنے والوں کو بپتسمہ دیتے تھے، یعنی توبہ کے بعد غسل کراتے تھے، تاکہ روح اور جسم دونوں پاک ہو جائیں۔ یہودیہ اور یروشلم کے بکثرت لوگ اُن کے معتقد ہو گئے تھے اور ان کے پاس جا کر بپتسمہ لیتے تھے۔ (مَرقُس ۱: ۴-۵) اسی بنا پر ان کا نام یُوحنّا بپتسمہ دینے والا (John The Baptist) مشہور ہو گیا تھا۔ عام طور پر بنی اسرائیل ان کی نبوت تسلیم کر چکے تھے۔ (متّی ۲۱: ۲۶) مسیح علیہ السلام کا قول تھا کہ "جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں، ان میں یُوحنّا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا۔" (متّی ۱۱: ۱۱)

وہ اُونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھے رہتے تھے، اور ان کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔ (متّی ۳: ۴) اس فقیرانہ زندگی کے ساتھ وہ مُنادی کرتے پھرتے تھے کہ "توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی نزدیک آ گئی ہے۔" (متّی ۳: ۲) یعنی مسیح علیہ السلام کی دعوتِ نبوت کا آغاز ہونے والا ہے۔ اسی بنا پر ان کو عموماً حضرت مسیحؑ کا "ارہاص" کہا جاتا ہے، اور یہی بات ان کے متعلق قرآن میں کہی گئی ہے کہ مُصَدِّقًۢا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ۔ (آلِ عمران: ۳۹)

وہ لوگوں کو روزے اور نماز کی تلقین کرتے تھے۔ (متّی ۹: ۱۴۔ لُوقا ۵: ۳۳۔ لُوقا ۱۱: ۱) وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ "جس کے پاس دو کُرتے ہوں وہ اُس کو جس کے پاس نہ ہو بانٹ دے، اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا ہی کرے۔" محصول لینے والوں نے پوچھا کہ اُستاد! ہم کیا کریں؟ تو انھوں نے فرمایا: "جو تمھارے لیے مقرر ہے اس سے زیادہ نہ لینا۔" سپاہیوں نے پوچھا: ہمارے لیے کیا ہدایت ہے؟ فرمایا: "نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ناحق کسی سے کچھ لو اور اپنی تنخواہ پر کفایت کرو۔" (لوقا ۳: ۱۰-۱۴)

وَاذۡكُرۡ فِی الۡكِتٰبِ مَرۡيَمَ ۘ اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَهۡلِهَا مَكَانًا شَرۡقِيًّا ۙ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ حِجَابًا ۖ فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا

وقف لازم

اور اے محمدؐ! اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو،[۱۳] جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہوگئی تھی اور پردہ ڈال کر اُن سے چُھپ بیٹھی تھی۔[۱۴] اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی رُوح کو (یعنی فرشتے کو) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی

بنی اسرائیل کے بگڑے ہوئے علما، فریسی اور صَدُوقی ان کے پاس بپتسمہ لینے آئے تو ڈانٹ کر فرمایا: ’’اے سانپ کے بچّو! تم کو کس نے جتا دیا کہ آنے والے غضب سے بھاگو؟...... اپنے دلوں میں یہ کہنے کا خیال نہ کرو کہ ابراہام ہمارا باپ ہے...... اب درختوں کی جڑوں پر کلھاڑا رکھا ہوا ہے، پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا، وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔‘‘ (مَتّی ۳: ۷-۱۰)

ان کے عہد کا یہودی فرمانروا، ہیرود اینٹی پاس، جس کی ریاست میں وہ دعوتِ حق کی خدمت انجام دیتے تھے، سرتاپا رومی تہذیب میں غرق تھا اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فِسق و فُجور پھیل رہا تھا۔ اس نے خود اپنے بھائی فِلِپ کی بیوی ہیرودیاس کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ حضرت یحییٰؑ نے اس پر ہیرود کو ملامت کی اور اس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اس جُرم میں ہیرود نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ تاہم وہ ان کو ایک مقدس اور راست باز آدمی جان کر ان کا احترام بھی کرتا تھا اور پبلک میں ان کے غیر معمولی اثر سے ڈرتا بھی تھا۔ لیکن ہیرودیاس یہ سمجھتی تھی کہ یحییٰؑ جو اَخلاقی روح قوم میں پھونک رہے ہیں، وہ لوگوں کی نگاہ میں اُس جیسی عورتوں کو ذلیل کیے دے رہی ہے۔ اس لیے وہ ان کی جان کے درپے ہوگئی۔ آخرِکار ہیرود کی سالگرہ کے جشن میں اس نے وہ موقع پالیا جس کی وہ تاک میں تھی۔ جشن کے دربار میں اس کی بیٹی نے خوب رقص کیا، جس پر خوش ہو کر ہیرود نے کہا: مانگ، کیا مانگتی ہے؟ بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا: کیا مانگوں؟ ماں نے کہا کہ یحییٰؑ کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اس نے ہیرود کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: مجھے یُوحَنّا بپتسمہ دینے والے کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی منگوا دیجیے۔ ہیرود یہ سن کر بہت غمگین ہُوا، مگر محبُوبہ کی بیٹی کا تقاضا کیسے رَدّ کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً قید خانے سے یحییٰؑ کا سر کٹوا کر منگوایا اور ایک تھال میں رکھوا کر رقاصہ کی نذر کر دیا۔ (مَتّی ۱۴: ۳-۱۱۔ مَرقُس ۶: ۱۷-۲۸۔ لُوقا ۳: ۱۹-۲۰)

۱۳ – تقابُل کے لیے تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۴۲، ۵۵، النساء، حاشیہ ۱۹۰-۱۹۱۔

۱۴ – سورۂ آلِ عمران میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے اپنی مانی ہوئی نذر کے مطابق ان کو بیت المَقدِس میں عبادت کے لیے بٹھا دیا تھا اور حضرت زکریّاؑ نے ان کی حفاظت و کفالت اپنے ذمّے لے لی تھی۔ وہاں یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت مریمؑ بیت المقدس کی ایک محراب میں معتکف ہوگئی تھیں۔ اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ محراب، جس میں حضرت مریمؑ معتکف تھیں بیت المَقدِس کے شرقی حصّے میں واقع تھی اور انھوں نے معتکفین کے عام طریقے کے مطابق ایک پردہ لٹکا کر اپنے آپ کو دیکھنے

بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾
قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ أَنَّىٰ
يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذَٰلِكِ
قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۖ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ

شکل میں نمودار ہو گیا۔

مریمؑ یکایک بول اُٹھی کہ "اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔"

اُس نے کہا: "میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دُوں۔"

مریمؑ نے کہا: "میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا؟ جب کہ مجھے کسی بَشَر نے چھوا تک نہیں ہے اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔"

فرشتے نے کہا: "ایسا ہی ہوگا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اُس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں[15] اور اپنی طرف سے ایک رحمت۔

والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے محض بائبل کی مُوافقت کی خاطر مَکَانًا شَرْقِيًّا سے مُراد ناصرہ لیا ہے، انھوں نے غلطی کی ہے، کیونکہ ناصرہ یروشلم کے شمال میں ہے نہ کہ مشرق میں۔

۱۵- جیسا کہ ہم حاشیہ ۶ میں اشارہ کر آئے ہیں، حضرت مریمؑ کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ "ایسا ہی ہوگا" ہرگز اس معنیٰ میں نہیں ہو سکتا کہ بشر تجھ کو چھوئے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا، باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔ اُوپر انھی الفاظ میں حضرت زکریاؑ کا استعجاب نقل ہو چکا ہے، اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مطلب اس جواب کا وہاں ہے، وہی یہاں بھی ہے۔ اسی طرح سورۂ ذاریات، آیات ۲۸-۳۰ میں جب فرشتہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور حضرت سارہؑ کہتی ہیں کہ مجھ بوڑھی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہوگا، تو فرشتہ اُن کو جواب دیتا ہے کہ كَذَٰلِكِ "ایسا ہی ہوگا"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود ان کے ہاں اولاد ہونا ہے۔ علاوہ بریں اگر كَذَٰلِكِ کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھے چھوئے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہوگا جیسے دنیا بھر کی عورتوں کے ہاں ہُوا کرتا ہے، تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنیٰ ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا

وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ

اور یہ کام ہو کر رہنا ہے۔"

مریمؑ کو اس بچّے کا حمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک دُور کے مَقام پر چلی گئی[16]۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اُسے ایک کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی: "کاش! میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام ونشان نہ رہتا۔"[17] فرشتے نے پائینتی سے اس کو پکار کر کہا: "غم نہ کر۔ تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے۔ اور تو ذرا اِس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اُوپر تر و تازہ

کرنا میرے لیے بہت آسان ہے، اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں۔ نشانی کا لفظ یہاں صریحاً معجزے کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، اور اسی معنیٰ پر یہ فقرہ بھی دلالت کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے"۔ لہٰذا اس ارشاد کا مطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کی تفصیلات اس بات کی خود تشریح کر رہی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی ذات کو کس طرح معجزہ بنا کر پیش کیا گیا۔

۱۶- دُور کے مقام سے مراد بیتِ لَحم ہے۔ حضرت مریمؑ کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المَقدِس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں، تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال، سب کو چھوڑ چھاڑ کر وہ زچگی کے لیے تن تنہا ایک دُور دراز مَقام پر چلی جاتیں۔

۱۷- ان الفاظ سے اُس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریمؑ اُس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت

رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾ فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ ۖ قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يَا أُخْتَ هَارُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

کھجوریں ٹپک پڑیں گی۔ پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمٰن کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی۔[۱۸]"

پھر وہ اس بچے کو لیے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے: "اے مریمؑ! یہ تو تُو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارونؑ کی بہن[۱۹]! نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔[۱۹الف]"

ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر اُن کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمایش میں انھیں ڈالا ہے، اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا، اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے اُن سے کہا "غم نہ کر" اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریمؑ نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے، اُسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہُوا کرتا۔

۱۸- مطلب یہ ہے کہ بچے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدایش پر جو کوئی بھی معترض ہو، اُس کا جواب اب ہمارے ذمّے ہے (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ رائج تھا)۔ یہ الفاظ بھی صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت مریمؑ کو اصل پریشانی کیا تھی۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلوٹی کا بچہ اگر دُنیا کے معروف طریقے پر پیدا ہو تو آخر اُسے چپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟

۱۹- ان الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ انھیں ظاہری معنیٰ میں لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مریمؑ کا کوئی بھائی ہارون نامی ہو۔ دوسرے، یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اُخْتَ ھٰرُوْنَ کے معنیٰ "ہارون کے خاندان کی لڑکی" لیے جائیں، کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے، مثلاً قبیلۂ مُضَر کے آدمی کو یا اخا مضر (اے مُضَر کے بھائی!) اور قبیلۂ ہمدان کے آدمی کو یا اخا ھمدان (اے ہمدان کے بھائی!) کہہ کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنیٰ کے حق میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنیٰ منقول ہوئے ہیں۔ اور دوسرے معنیٰ کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اِس معنیٰ کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ اس واقعے سے قوم میں جو ہیجان برپا ہوا تھا، اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک گمنام شخص کی کنواری بہن

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ﴿٣٠﴾ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا

مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔

لوگوں نے کہا: "ہم اِس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچّہ[20] ہے؟"

بچہ بول اُٹھا: "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی، اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا

گود میں بچہ لیے ہوئے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک ہجوم حضرت مریمؑ کے گرد جمع کر دیا تھا، وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خانوادۂ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیثِ مرفوع کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل اُصولاً قابلِ لحاظ نہیں ہو سکتی، لیکن مسلم، نَسائی اور ترمِذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے، اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنی لازماً "ہارون کی بہن" ہی ہیں۔ مُغیرہؓ بن شُعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے، کہ نَجران کے عیسائیوں نے حضرت مغیرہؓ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریمؑ کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے، حالانکہ حضرت ہارونؑ ان سے سیکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہؓ ان کے اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے اور انھوں نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماجرا عرض کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ "تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیا اور صلحا کے نام پر رکھتے تھے؟" حضورؐ کے اس ارشاد سے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ لاجواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جا سکتا تھا۔

۱۹، الف — جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدایش کے منکر ہیں، وہ آخر اس بات کی کیا معقول توجیہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کے بچہ لیے ہوئے آنے پر قوم کیوں چڑھ کر آئی اور اُن پر یہ طعن اور ملامت کی بوچھاڑ اس نے کیوں کی؟

۲۰ — قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ "ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے۔" یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو حضرت عیسیٰؑ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی، اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گہوارے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر جو شخص موقع و محل اور سیاق و سباق پر کچھ بھی غور کرے گا، وہ محسوس کر لے گا کہ یہ محض ایک مُہمَل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے وہ لوگ آئے تھے، وہ تو بچے کی پیدایش کے وقت پیش آئی تھی، نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔ علاوہ بریں سورۂ آلِ عمران کی آیت ۴۶، اور سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰، دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گہوارے میں ایک نوزائیدہ بچّے کی حیثیت ہی سے کیا تھا۔ پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود

اَیۡنَ مَا كُنۡتُ ۖ وَاَوۡصٰنِىۡ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمۡتُ حَيًّا ۖ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِىۡ وَلَمۡ يَجۡعَلۡنِىۡ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوۡمَ وُلِدْتُّ وَيَوۡمَ اَمُوۡتُ وَيَوۡمَ اُبۡعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾ ذٰ لِكَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ ۚ قَوۡلَ الۡحَـقِّ الَّذِىۡ فِيۡهِ يَمۡتَرُوۡنَ ﴿۳۴﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنۡ يَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ؕ﴿۳۵﴾

جہاں بھی میں رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں، اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا[۲۰الف]، اور مجھ کو جبّار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر جب کہ میں پیدا ہوا، اور جب کہ میں مروں، اور جب کہ زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں[۲۱]۔"

یہ ہے عیسٰیؑ ابنِ مریم، اور یہ ہے اُس کے بارے میں وہ سچّی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ وہ پاک ذات ہے۔ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا، اور بس وہ ہو جاتی ہے[۲۲]۔

حضرت عیسٰیؑ سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرتا تھا اور جوانی میں بھی۔

۲۰، الف— یہ نہیں فرمایا کہ والدین کا حق ادا کرنے والا۔ صرف والدہ کا حق ادا کرنے والا فرمایا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اور اسی کی ایک صریح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ اُن کو عیسٰیؑ ابنِ مریم کہا گیا ہے۔

۲۱— یہ ہے وہ "نشانی" جو حضرت عیسٰیؑ کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرت ناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو، جو بیت المَقدِس میں معتکف اور حضرت زکریاؑ کے زیرِ تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا، تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے اور لوگوں کی توجُّہات یکلخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک ہجوم حضرت مریمؑ پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا، تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود رہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور

وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۳۶﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۳۷﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ ۙ یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۸﴾ وَ اَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ ۘ وَ هُمْ فِیْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ

وقف لازم

(اور عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ) ''اللہ میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی، پس تم اس کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔[۲۳]'' مگر پھر مختلف گروہ[۲۴] باہم اختلاف کرنے لگے۔ سو جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے وہ وقت بڑی تباہی کا ہوگا جب کہ وہ ایک بڑا دن دیکھیں گے۔ جب وہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے، اُس روز تو اُن کے کان بھی خوب سُن رہے ہوں گے اور ان کی آنکھیں بھی خوب دیکھتی ہوں گی، مگر آج یہ ظالم کُھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اے محمدؐ! اِس حالت میں، جب کہ یہ لوگ غافل ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں، اِنھیں اس دن سے ڈرا دو جب کہ فیصلہ کر دیا جائے گا اور پچھتاوے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا۔ آخر کار ہم ہی زمین

اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے مجرم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے جو دُنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۴۴، ۵۳۔ النساء، حاشیہ ۲۱۲-۲۱۳۔ جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۸-۸۹-۹۰۔ المومنون، حاشیہ ۴۳)

۲۲ — یہاں تک جو بات عیسائیوں کے سامنے واضح کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ ہونے کا جو عقیدہ انھوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ باطل ہے۔ جس طرح ایک معجزے سے حضرت یحییٰؑ کی پیدائش نے اُن کو خدا کا بیٹا نہیں بنا دیا، اُسی طرح ایک دوسرے معجزے سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر انھیں خدا کا بیٹا قرار دے دیا جائے۔ عیسائیوں کی اپنی روایات میں بھی یہ بات موجود ہے کہ حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ، دونوں ایک ایک طرح کے معجزے سے پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ لوقا کی انجیل میں قرآن ہی کی طرح ان دونوں معجزوں کا ذکر ایک سلسلۂ بیان میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ عیسائیوں کا غُلُو ہے کہ وہ ایک معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بندہ کہتے ہیں، اور دوسرے معجزے سے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بیٹا بنا بیٹھے ہیں۔

وَمَنۡ عَلَيۡهَا وَاِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۴۰﴾ وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِىۡ عَنۡكَ شَيۡــًٔـا ﴿۴۲﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡ

اور اس کی ساری چیزوں کے وارث ہوں گے اور سب ہماری طرف ہی پلٹائے جائیں گے۔ع۵

اور اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصّہ بیان کرو،[26] بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔ (انھیں ذرا اُس موقع کی یاد دلاؤ) جب کہ اُس نے اپنے باپ سے کہا کہ ”ابّا جان! آپ کیوں اُن چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سُنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابّا جان! میرے

۲۳ – یہاں عیسائیوں کو بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی دعوت بھی وہی تھی جو تمام انبیا علیہم السلام لے کر آئے تھے۔ انھوں نے اس کے سوا کچھ نہیں سکھایا تھا کہ صرف خدائے واحد کی بندگی کی جائے۔ اب یہ جو تم نے ان کو بندے کے بجائے خدا بنا لیا ہے اور اُنھیں عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک کر رہے ہو، یہ تمھاری اپنی ایجاد ہے۔ تمھارے پیشوا کی یہ تعلیم ہرگز نہیں تھی۔ (مزید تفصیل کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، آلِ عمران، حاشیہ ۶۸۔ مائدہ، حاشیہ ۱۰۰-۱۰۱، ۱۳۰۔ جلد چہارم۔ الزُّخرُف، حواشی ۵۷-۵۸)

۲۴ – یعنی عیسائیوں کے گروہ۔

۲۵ – یہاں وہ تقریر ختم ہوتی ہے جو عیسائیوں کو سنانے کے لیے نازل فرمائی گئی تھی۔ اِس تقریر کی عظمت کا صحیح اندازہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آدمی اس کو پڑھتے وقت وہ تاریخی پَس منظر نگاہ میں رکھے جو ہم نے اِس سورہ کے دیباچے میں بیان کیا ہے۔ یہ تقریر اُس موقع پر نازل ہوئی تھی جب کہ مکے کے مظلوم مسلمان ایک عیسائی سلطنت میں پناہ لینے کے لیے جا رہے تھے، اور اس غرض کے لیے نازل کی گئی تھی کہ جب وہاں مسیحؑ کے متعلق اسلامی عقائد کا سوال چھڑے تو یہ ”سرکاری بیان“ عیسائیوں کو سنا دیا جائے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہو سکتا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو کسی حال میں بھی حق و صداقت کے معاملے میں مداہنت برتنا نہیں سکھایا ہے۔ پھر وہ سچّے مسلمان جو حبش کی طرف ہجرت کر کے گئے تھے، اُن کی قوتِ ایمانی بھی حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے عین دربارِ شاہی میں ایسے نازک موقع پر اُٹھ کر یہ تقریر سنا دی جب کہ نجاشی کے تمام اہلِ دربار رشوت کھا کر اُنھیں ان کے دشمنوں کے سُپرد کر دینے پر تُلے گئے تھے۔ اُس وقت اس امر کا پورا خطرہ تھا کہ مسیحیت کے بنیادی عقائد پر اسلام کا یہ بے لاگ تبصرہ سُن کر نجاشی بھی بگڑ جائے گا اور ان مظلوم مسلمانوں کو قریش کے قسائیوں کے حوالے کر دے گا۔ مگر اس کے باوجود انھوں نے کلمۂ حق پیش کرنے میں ذرّہ برابر تأمّل نہ کیا۔

قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ﴿۴۳﴾ یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا ﴿۴۴﴾ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا ﴿۴۵﴾ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَىٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ

پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، آپ میرے پیچھے چلیں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابّا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کریں[۲۷]، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابّا جان! مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔"

باپ نے کہا: "ابراہیمؑ! کیا تو میرے معبُودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دُوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔"

ابراہیمؑ نے کہا: "سلام ہے آپ کو۔[۲۷ الف] میں اپنے رب سے دُعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے،

۲۶ — یہاں سے خطاب کا رُخ اہلِ مکّہ کی طرف پھر رہا ہے جنھوں نے اپنے نوجوان بیٹوں، بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کو اُسی طرح خدا پرستی کے جرم میں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے باپ اور بھائی بندوں نے دیس نکالا دیا تھا۔ اس غرض کے لیے دوسرے انبیاؑ کو چھوڑ کر خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کے قصّے کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ قریش کے لوگ ان کو اپنا پیشوا مانتے تھے اور انھی کی اولاد ہونے پر عرب میں اپنا فخر جتایا کرتے تھے۔

۲۷ — اصل الفاظ ہیں: لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ؕ، یعنی "شیطان کی عبادت نہ کریں۔" اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے والد اور قوم کے دوسرے لوگ عبادت بتوں کی کرتے تھے، لیکن چونکہ اطاعت وہ شیطان کی کر رہے تھے، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان کی اِس اطاعتِ شیطان کو بھی عبادتِ شیطان قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت محض پوجا اور پرستش ہی کا نام نہیں بلکہ اطاعت کا نام بھی ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی پر لعنت کرتے ہوئے بھی اس کی بندگی بجا لائے تو وہ اُس کی عبادت کا مجرم ہے، کیونکہ شیطان بہرحال کسی زمانے میں بھی لوگوں کا "معبُود" (بمعنیٰ معروف) نہیں رہا ہے، بلکہ اس کے نام پر ہر زمانے میں لوگ لعنت ہی بھیجتے رہے ہیں۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم،

إِنَّهُۥ كَانَ بِى حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَأَدْعُوا رَبِّى عَسَىٰٓ أَلَّآ أَكُونَ بِدُعَآءِ رَبِّى شَقِيًّا ﴿٤٨﴾ فَلَمَّا ٱعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَهَبْنَا لَهُۥٓ إِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾ ع وَٱذْكُرْ فِى ٱلْكِتَٰبِ مُوسَىٰٓ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ﴿٥١﴾

میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنھیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا، اُمید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کے نامراد نہ رہوں گا۔"

پس جب وہ اُن لوگوں سے اور اُن کے معبودانِ غیر اللہ سے جدا ہو گیا تو ہم نے اُس کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا اور ان کو سچّی نام وری عطا کی[28]۔ ع

اور ذکر کرو اس کتاب میں موسیٰ کا۔ وہ ایک چیدہ[29] شخص تھا اور رسول نبی[30] تھا۔

الکہف، حاشیہ ۴۹-۵۰)

۲۷، الف- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۱۱۲۔

۲۸- یہ حرفِ تسلّی ہے اُن مہاجرین کے لیے جو گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے خاندان سے کٹ کر برباد نہ ہوئے بلکہ اُلٹے سربلند و سرفراز ہو کر رہے، اُسی طرح تم بھی برباد نہ ہو گے، بلکہ وہ عزت پاؤ گے جس کا تصور بھی جاہلیت میں پڑے ہوئے کفارِ قریش نہیں کر سکتے۔

۲۹- اصل میں لفظ مُخْلَص استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں "خالص کیا ہوا"۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ ایک ایسے شخص تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے خالص اپنا کر لیا تھا۔

۳۰- "رسول" کے معنیٰ ہیں "فرستادہ"، "بھیجا ہوا"۔ اس معنیٰ کے لحاظ سے عربی زبان میں قاصد، پیغام بر، ایلچی اور سفیر کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور قرآن میں یہ لفظ یا تو ان ملائکہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کارِ خاص پر بھیجے جاتے ہیں، یا پھر اُن انسانوں کو اس نام سے موسوم کیا گیا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے خلق کی طرف اپنا پیغام

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ

ہم نے اُس کو طُور کے داہنی جانب سے پکارا[۳۱] اور راز کی گفتگو سے اس کو تقرب عطا کیا[۳۲]، اور اپنی مہربانی سے

پہنچانے کے لیے مامور فرمایا۔

''نبی'' کے معنیٰ میں اہلِ لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو لفظ نَبَأ سے مُشتق قرار دیتے ہیں، جس کے معنیٰ ''خبر'' کے ہیں، اور اس اصل کے لحاظ سے نبی کے معنیٰ ''خبر دینے والے'' کے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا مادّہ نبو ہے، یعنی رفعت اور بلندی۔ اور اس معنیٰ کے لحاظ سے نبی کا مطلب ہے: ''بلند مرتبہ'' اور ''عالی مقام''۔ ازہری نے کسائی سے ایک تیسرا قول بھی نقل کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل نبیٔ ہے، جس کے معنیٰ طریق اور راستے کے ہیں، اور انبیاؑ کو نبی اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف جانے کا راستہ ہیں۔

پس کسی شخص کو ''رسول نبی'' کہنے کا مطلب یا تو ''عالی مَقام پیغمبر'' ہے، یا ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبریں دینے والا پیغمبر''، یا پھر ''وہ پیغمبر جو اللہ کا راستہ بتانے والا ہے''۔

قرآنِ مجید میں یہ دونوں الفاظ بالعُموم ہم معنیٰ استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی شخصیت کو کہیں صرف رسول کہا گیا ہے، اور کہیں صرف نبی، اور کہیں رسول اور نبی ایک ساتھ۔ لیکن بعض مَقامات پر رسول اور نبی کے الفاظ اس طرح بھی استعمال ہوئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مرتبے یا کام کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی اصطلاحی فرق ہے۔ مثلاً سورۂ حج، رُکوع ۷ میں فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ...... ''ہم نے تم سے پہلے نہیں بھیجا کوئی رسول اور نہ نبی مگر......'' یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ رسول اور نبی دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں، جن کے درمیان کوئی معنوی فرق ضرور ہے۔ اسی بنا پر اہلِ تفسیر میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ اس فرق کی نوعیت کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قطعی دلائل کے ساتھ کوئی بھی رسول اور نبی کی الگ الگ حیثیتوں کا تعیُّن نہیں کر سکا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ نبی کی بہ نسبت خاص ہے، یعنی ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے، مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا، یا بالفاظِ دیگر، انبیاؑ میں سے رسول کا لفظ اُن جلیل القدر ہستیوں کے لیے بولا گیا ہے جن کو عام انبیاؑ کی بہ نسبت زیادہ اہم منصب سُپرد کیا گیا تھا۔ اِسی کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت ابواُمامہؓ سے اور حاکم نے حضرت ابوذرؓ سے نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رسولوں کی تعداد پوچھی گئی تو آپؐ نے ۳۱۳ یا ۳۱۵ بتائی، اور انبیاؑ کی تعداد پوچھی گئی تو آپؐ نے ایک لاکھ ۲۴ ہزار بتائی۔ اگرچہ اس حدیث کی سندیں ضعیف ہیں، مگر کئی سندوں سے ایک بات کا نقل ہونا اس کے ضعف کو بڑی حد تک دُور کر دیتا ہے۔

۳۱– کوہِ طور کے داہنی جانب سے مراد اس کا مشرقی دامن ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ مَدیَن سے مصر جاتے ہوئے اُس راستے سے گزر رہے تھے جو کوہِ طُور کے جنوب سے جاتا ہے، اور جنوب کی طرف سے اگر کوئی شخص طور کو دیکھے تو اس کے دائیں جانب مشرق اور بائیں جانب مغرب ہوگا، اس لیے حضرت موسیٰؑ کی نسبت سے طور کے مشرقی دامن کو ''داہنی جانب''

مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

اس کے بھائی ہارونؑ کو نبی بنا کر اُسے (مددگار کے طور پر) دیا۔

اور اس کتاب میں اسماعیلؑ کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچّا تھا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا۔[۳۳]

اور اس کتاب میں ادریسؑ کا ذکر کرو۔ وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا اور اُسے ہم نے بلند مقام پر اُٹھایا تھا۔[۳۴]

فرمایا گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بجائے خود پہاڑ کا کوئی دایاں یا بایاں رُخ نہیں ہوتا۔

۳۲– تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۲۰۶۔

۳۳– حضرت ادریسؑ کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک وہ بنی اسرائیل میں سے کوئی نبی تھے۔ مگر اکثریت اس طرف گئی ہے کہ وہ حضرت نوحؑ سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث ہم کو ایسی نہیں ملی جس سے ان کی شخصیت کے تعیُّن میں کوئی مدد ملتی ہو۔ البتہ قرآن کا ایک اشارہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ وہ حضرت نوحؑ سے متقدم ہیں۔ کیونکہ بعد والی آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ انبیا جن کا ذکر اُوپر گزرا ہے، آدمؑ کی اولاد، نوحؑ کی اولاد، ابراہیمؑ کی اولاد اور اسرائیلؑ کی اولاد سے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ، عیسیٰ اور موسیٰ علیہم السلام تو بنی اسرائیل میں سے ہیں، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ اولادِ ابراہیمؑ سے ہیں، اور حضرت ابراہیمؑ اولادِ نوحؑ سے، اس کے بعد صرف حضرت ادریسؑ ہی رہ جاتے ہیں جن کے متعلق یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اولادِ آدمؑ سے ہیں۔

مفسرین کا عام خیال یہ ہے کہ بائبل میں جن بزرگ کا نام حَنُوک (Enoch) بتایا گیا ہے، وہی حضرت ادریسؑ ہیں۔ ان کے متعلق بائبل کا بیان یہ ہے:

"اور حَنُوک پینسٹھ برس کا تھا جب اس سے متوسلح پیدا ہوا، اور متوسلح کی پیدائش کے بعد حَنُوک تین سو برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا............ اور وہ غائب ہوگیا، کیونکہ خدا نے اسے اُٹھا لیا۔"

أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِم مِّنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مِن ذُرِّيَّةِ ءَادَمَ وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوحٖ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡرَٰٓءِيلَ وَمِمَّنۡ هَدَيۡنَا وَٱجۡتَبَيۡنَآۚ إِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتُ ٱلرَّحۡمَٰنِ خَرُّواْۤ سُجَّدٗاۤ وَبُكِيّٗا ۩ ﴿٥٨﴾ السجدة

السجدة ۵

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُواْ ٱلشَّهَوَٰتِ

یہ وہ پیغمبرؑ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا آدمؑ کی اولاد میں سے، اور اُن لوگوں کی نسل سے جنھیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا، اور ابراہیمؑ کی نسل سے اور اسرائیلؑ کی نسل سے۔ اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمٰن کی آیات ان کو سُنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔ سجدہ

پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا[۳۵] اور خواہشاتِ نفس

(پیدائش، باب ۵، آیت ۲۱-۲۴)

تلمود کی اسرائیلی روایات میں ان کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نوحؑ سے پہلے جب بنی آدم میں بگاڑ کی ابتدا ہوئی تو خدا کے فرشتے نے حنوک کو، جو لوگوں سے الگ تھلگ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، پکارا کہ "اے حنوک! اُٹھو، گوشۂ عزلت سے نکلو اور زمین کے باشندوں میں چل پھر کر ان کو وہ راستہ بتاؤ جس پر ان کو چلنا چاہیے، اور وہ طریقے بتاؤ جن پر انھیں عمل کرنا چاہیے۔" یہ حکم پا کر وہ نکلے اور انھوں نے جگہ جگہ لوگوں کو جمع کر کے وعظ و تلقین کی اور نسلِ انسانی نے ان کی اطاعت قبول کر کے اللہ کی بندگی اختیار کر لی۔ حنوک ۳۵۳ برس تک نسلِ انسانی پر حکمراں رہے۔ ان کی حکومت انصاف اور حق پرستی کی حکومت تھی۔ ان کے عہد میں زمین پر خدا کی رحمتیں برستی رہیں۔ (The Talmud Selections, pp 18-21)

۳۴- اس کا سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کو بلند مرتبہ عطا کیا تھا، لیکن اسرائیلی روایات سے منتقل ہو کر یہ بات ہمارے ہاں بھی مشہور ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریسؑ کو آسمان پر اُٹھا لیا۔ بائبل میں تو صرف اسی قدر ہے کہ وہ غائب ہو گئے، کیونکہ "خدا نے ان کو اُٹھا لیا"، مگر تلمود میں اس کا ایک طویل قصّہ بیان ہوا ہے، جس کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ "حنوک ایک بگولے میں آتشیں رتھ اور گھوڑوں سمیت آسمان پر چڑھ گئے۔"

۳۵- یعنی نماز پڑھنی چھوڑ دی، یا نماز سے غفلت اور بے پروائی برتنے لگے۔ یہ ہر اُمّت کے زوال و انحطاط کا پہلا

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ﴿٦٠﴾ جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا ﴿٦١﴾ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا ۖ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ﴿٦٢﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ

کی پیروی کی[۳۶]، پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔ البتہ جو توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عملی اختیار کرلیں، وہ جنّت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرّہ برابر حق تلفی نہ ہوگی۔ ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں، جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے درپردہ وعدہ کر رکھا ہے[۳۷]۔ اور یقیناً یہ وعدہ پورا ہو کر رہنا ہے۔ وہاں وہ کوئی بیہودہ بات نہ سُنیں گے، جو کچھ بھی سُنیں گے ٹھیک ہی سُنیں گے[۳۸]۔ اور ان کا رزق انھیں پیہم صبح و شام ملتا رہے گا۔ یہ ہے وہ جنّت جس کا وارث

قدم ہے۔ نماز وہ اوّلین رابطہ ہے جو مومن کا زندہ اور عملی تعلق خدا کے ساتھ شب و روز جوڑے رکھتا ہے اور اسے خدا پرستی کے مرکز و محوَر سے بچھڑنے نہیں دیتا۔ یہ بندھن ٹوٹتے ہی آدمی خدا سے دُور اور دُور تر ہوتا چلا جاتا ہے، حتّٰی کہ عملی تعلق سے گزر کر اس کا خیالی تعلّق بھی خدا کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ بات ایک قاعدۂ کُلّیّہ کے طور پر بیان فرمائی ہے کہ پچھلے تمام انبیاؑ کی اُمتوں کا بگاڑ نماز ضائع کرنے سے شروع ہوا ہے۔

۳۶– یہ تعلق باللہ کی کمی اور اس کے فُقدان کا لازمی نتیجہ ہے۔ نماز کی اضاعت سے جب دل خدا کی یاد سے غافل رہنے لگے تو جوں جوں یہ غفلت بڑھتی گئی، خواہشاتِ نفس کی بندگی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ان کے اَخلاق اور معاملات کا ہر گوشہ احکامِ الٰہی کے بجائے اپنے من مانے طریقوں کا پابند ہو کر رہا۔

۳۷– یعنی جس کا وعدہ رحمٰن نے اس حالت میں کیا ہے کہ وہ جنتیں ان کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔

۳۸– اصل میں لفظ ''سلام'' استعمال ہوا ہے، جس کے معنٰی ہیں: عیب اور نَقص سے محفوظ۔ جنت میں جو نعمتیں انسان کو میسّر ہوں گی، ان میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہوگی کہ وہاں کوئی بیہودہ اور فضول اور گندی بات سننے میں نہ آئے گی۔ وہاں کا پورا معاشرہ ایک ستھرا اور سنجیدہ اور پاکیزہ معاشرہ ہوگا، جس کا ہر فرد سلیم الطبع ہوگا۔ وہاں کے رہنے والوں کو غیبتوں اور گالیوں اور فحش گانوں اور دوسری بُری آوازوں کی سماعت سے پوری نجات مل جائے گی۔ وہاں آدمی جو کچھ بھی سنے گا، بھلی اور معقول اور بجا باتیں ہی سُنے گا۔ اِس نعمت کی قدر وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اس دُنیا میں فی الواقع ایک پاکیزہ اور ستھرا ذوق رکھتا ہو۔ کیونکہ وہی یہ محسوس

مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾ وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۖ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾ وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾

ہم اپنے بندوں میں سے اُس کو بنائیں گے جو پرہیزگار رہا ہے۔

اے محمدؐ! ہم تمھارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اُترا کرتے[39]۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے، ہر چیز کا مالک وہی ہے اور تمھارا رب بُھولنے والا نہیں ہے۔ وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور اُن ساری چیزوں کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں۔ پس تم اُس کی بندگی کرو اور اُسی کی بندگی پر ثابت قدم رہو[40]۔ کیا ہے کوئی ہستی تمھارے علم میں اس کی ہم پایہ؟[41] ع

انسان کہتا ہے: کیا واقعی جب میں مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟

کرسکتا ہے کہ انسان کے لیے ایک ایسی گندی سوسائٹی میں رہنا کتنی بڑی مصیبت ہے جہاں کسی وقت بھی اس کے کان جھوٹ، غیبت، فتنہ وفساد، شرارت، گندگی اور شہوانیت کی باتوں سے محفوظ نہ ہوں۔

۳۹ — یہ پورا پیراگراف ایک جملۂ معترضہ ہے جو ایک سلسلۂ کلام کو ختم کر کے دوسرا سلسلۂ کلام شروع کرنے سے پہلے ارشاد ہُوا ہے۔ اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ سورت بڑی دیر کے بعد ایسے زمانے میں نازل ہوئی ہے جب کہ نبیؐ اور آپؐ کے صحابہؓ بڑے اضطراب انگیز حالات سے گزر رہے ہیں۔ حضورؐ کو اور آپؐ کے صحابیوں کو ہر وقت وحی کا انتظار ہے، تاکہ اس سے رہنمائی بھی ملے اور تسلّی بھی حاصل ہو۔ جوں جوں وحی آنے میں دیر ہو رہی ہے، اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ اس حالت میں جبریل علیہ السلام فرشتوں کے جھرمٹ میں تشریف لاتے ہیں۔ پہلے وہ فرمان سناتے ہیں جو موقع کی ضرورت کے لحاظ سے فوراً درکار تھا۔ پھر آگے بڑھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے اشارے سے یہ چند کلمات اپنی طرف سے کہتے ہیں، جن میں اتنی دیر تک اپنے حاضر نہ ہونے کی معذرت بھی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرفِ تسلی بھی، اور ساتھ ساتھ صبر و ضبط کی تلقین بھی۔

یہ صرف کلام کی اندرونی شہادت ہی نہیں ہے بلکہ متعدّد روایات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں جنھیں ابنِ جریر، ابنِ کثیر اور صاحبِ رُوح المعانی وغیرہم نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

۴۰ — یعنی اس کی بندگی کے راستے پر مضبوطی کے ساتھ چلو اور اس راہ میں جو مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں، ان کا

أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ
لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ
مِن كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ
بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ
حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

کیا انسان کو یاد نہیں آتا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟ تیرے رب کی قسم! ہم ضرور ان سب کو اور ان کے ساتھ شیاطین کو بھی[42] گھیر لائیں گے، پھر جہنّم کے گرد لا کر انھیں گھٹنوں کے بل گرا دیں گے۔ پھر ہر گروہ میں سے ہر اُس شخص کو چھانٹ لیں گے جو رحمٰن کے مقابلے میں زیادہ سرکش بنا ہوا تھا،[43] پھر یہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے بڑھ کر جہنّم میں جھونکے جانے کا مستحق ہے۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنّم پر وارد نہ ہو،[44] یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پُورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے۔ پھر ہم اُن لوگوں کو بچا لیں گے جو (دُنیا میں) متقی تھے اور ظالموں کو اُسی میں گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

صبر کے ساتھ مقابلہ کرو۔ اگر اس کی طرف سے یاد فرمائی اور مدد اور تسلی میں کبھی دیر لگ جایا کرے تو اس پر گھبراؤ نہیں۔ ایک مطیعِ فرمان بندے کی طرح ہر حال میں اس کی مشیّت پر راضی رہو اور پورے عزم کے ساتھ وہ خدمت انجام دیے چلے جاؤ جو ایک بندے اور رسول کی حیثیت سے تمھارے سُپرد کی گئی ہے۔

۴۱ – اصل میں لفظ سَمی استعمال ہوا ہے، جس کے لُغوی معنیٰ ''ہم نام'' کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تو اللہ ہے، کیا کوئی دُوسرا اللہ بھی تمھارے علم میں ہے؟ اگر نہیں ہے، اور تم جانتے ہو کہ نہیں ہے، تو پھر تمھارے لیے اس کے سوا اور راستہ ہی کون سا ہے کہ اس کی بندگی کرو اور اس کے حکم کے بندے بن کر رہو۔

۴۲ – یعنی اُن شیاطین کو جن کے یہ چیلے بنے ہوئے ہیں اور جن کے سکھائے پڑھائے میں آ کر انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ زندگی جو کچھ بھی ہے بس یہی دُنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں جہاں ہمیں خدا کے سامنے حاضر ہونا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہو۔

۴۳ – یعنی ہر باغی گروہ کا لیڈر۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۳﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۴﴾ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ

اِن لوگوں کو جب ہماری کُھلی کُھلی آیات سُنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں: "بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں زیادہ شان دار ہیں؟"[۴۵] حالانکہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو اِن سے زیادہ سروسامان رکھتی تھیں اور ظاہری شان وشوکت میں اِن سے بڑھی ہوئی تھیں۔ اِن سے کہو: جو شخص گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے اُسے رحمٰن ڈھیل دیا کرتا ہے، یہاں تک کہ جب ایسے لوگ وہ چیز دیکھ لیتے ہیں جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے ـــــ خواہ وہ عذابِ الٰہی ہو یا قیامت کی گھڑی ـــــ تب انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا حال خراب ہے اور کس کا جتّھا کمزور! اس کے برعکس جو لوگ راہِ راست اختیار کرتے ہیں، اللہ ان کو راست روی میں ترقی عطا فرماتا ہے،[۴۶] اور باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے

۴۴ــ "وارد ہونے" کے معنیٰ بعض روایات میں "داخل ہونے" کے بیان کیے گئے ہیں، مگر ان میں سے کسی کی سند بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک قابلِ اعتماد ذرائع سے نہیں پہنچتی۔ اور پھر یہ بات قرآنِ مجید اور اُن کثیر التعداد صحیح احادیث کے بھی خلاف ہے جن میں مومنینِ صالحین کے دوزخ میں جانے کی قطعی نفی کی گئی ہے۔ مزید برآں لغت میں بھی ورود کے معنیٰ دخول کے نہیں ہیں۔ اس لیے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ جہنم پر گزر تو سب کا ہوگا مگر، جیسا کہ بعد والی آیت بتا رہی ہے، پرہیز گار لوگ اس سے بچا لیے جائیں گے اور ظالم اس میں جھونک دیے جائیں گے۔

۴۵ــ یعنی ان کا اِستدلال یہ تھا کہ دیکھ لو، دُنیا میں کون اللہ کے فضل اور اس کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے۔

عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿٧٦﴾ اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٧٧﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٧٨﴾ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾ ع

ع ۵ ۱۷ ۸

رب کے نزدیک جزا اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں۔

پھر تو نے دیکھا اُس شخص کو جو ہماری آیات کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا؟[۴۷] کیا اسے غیب کا پتا چل گیا ہے یا اس نے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ —— ہرگز نہیں، جو کچھ یہ بکتا ہے، اسے ہم لکھ لیں[۴۸] گے اور اس کے لیے سزا میں اور زیادہ اضافہ کریں گے۔ جس سرو سامان اور لاؤ لشکر کا یہ ذکر کر رہا ہے، وہ سب ہمارے پاس رہ جائے گا اور یہ اکیلا ہمارے سامنے حاضر ہو گا۔

اِن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ خدا بنا رکھے ہیں، تاکہ وہ اِن کے پشتیبان ہوں[۴۹]۔ کوئی پشتیبان نہ ہو گا۔ وہ سب ان کی عبادت کا انکار کریں[۵۰] گے اور اُلٹے اِن کے مخالف بن جائیں گے۔ ع

کس کے گھر زیادہ شان دار ہیں؟ کس کا معیارِ زندگی زیادہ بلند ہے؟ کس کی محفلیں زیادہ ٹھاٹ سے جمتی ہیں؟ اگر یہ سب کچھ ہمیں میسّر ہے اور تم اس سے محروم ہو تو خود سوچ لو کہ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم باطل پر ہوتے اور یوں مزے اُڑاتے، اور تم حق پر ہوتے اور اس طرح خستہ و درماندہ رہتے؟ مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، الکہف، حواشی ۳۷-۳۸۔

۴۶ – یعنی ہر آزمایش کے موقع پر اللہ تعالیٰ ان کو صحیح فیصلے کرنے اور صحیح راستہ اختیار کرنے کی توفیق بخشتا ہے، اُن کو بُرائیوں اور غلطیوں سے بچاتا ہے، اور اس کی ہدایت و رہنمائی سے وہ برابر راہِ راست پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

۴۷ – یعنی وہ کہتا ہے کہ تم مجھے خواہ کتنا ہی گمراہ و بدکار کہتے رہو اور عذابِ الٰہی کے ڈراوے دیا کرو، میں تو آج بھی تم سے زیادہ خوش حال ہوں اور آیندہ بھی مجھ پر نعمتوں کی بارش ہوتی رہے گی۔ میری دولت دیکھو، میری وجاہت اور ریاست دیکھو،

اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّاۙ۝۸۳ فَلَا تَعْجَلْ عَلَیْهِمْؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّاۚ۝۸۴ یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًاۙ۝۸۵ وَّ نَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًاۘ۝۸۶ لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًاۘ۝۸۷ وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًاؕ۝۸۸ لَقَدْ جِئْتُمْ

وقف لازم وقف لازم

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے اِن منکرینِ حق پر شیاطین چھوڑ رکھے ہیں جو انھیں خُوب خُوب (مُخالفَتِ حق پر) اکسا رہے ہیں؟ اچھا، تو اب اِن پر نزولِ عذاب کے لیے بے تاب نہ ہو۔ ہم اِن کے دن گِن رہے ہیں[51]۔ وہ دن آنے والا ہے جب متقی لوگوں کو ہم مہمانوں کی طرح رحمٰن کے حُضور پیش کریں گے، اور مجرموں کو پیاسے جانوروں کی طرح جہنّم کی طرف ہانک لے جائیں گے۔ اُس وقت لوگ کوئی سِفارش لانے پر قادر نہ ہوں گے، بجز اُس کے جس نے رحمٰن کے حُضور سے پروانہ حاصل کرلیا ہو۔[52]

وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے ـــــــ سخت بے ہُودہ بات ہے جو

میرے نامور بیٹوں کو دیکھو، میری زندگی میں آخر تمھیں کہاں یہ آثار نظر آتے ہیں کہ میں خدا کا مغضوب ہوں؟ ــــ یہ مکے میں کسی ایک شخص کے خیالات نہ تھے بلکہ کفارِ مکہ کا ہر شیخ اور سردار اسی خبط میں مبتلا تھا۔

۴۸ – یعنی اس کے جرائم کے ریکارڈ میں اس کا یہ کلمۂ غرور بھی شامل کرلیا جائے گا اور اس کا مزا بھی اسے چکھنا پڑے گا۔

۴۹ – اصل میں لفظ عِزًّا استعمال ہوا ہے، یعنی وہ ان کے لیے سببِ عزت ہوں۔ مگر عزت سے مراد عَرَبی زبان میں کسی شخص کا ایسا طاقت ور اور زبردست ہونا ہے کہ اس پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکے، اور ایک شخص کا دوسرے شخص کے لیے سببِ عزت بننا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ اس کی حمایت پر ہو، جس کی وجہ سے اس کا کوئی مخالف اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھ سکے۔

۵۰ – یعنی وہ کہیں گے کہ نہ ہم نے کبھی اِن سے کہا تھا کہ ہماری عبادت کرو، اور نہ ہمیں یہ خبر تھی کہ یہ احمق لوگ ہماری عبادت کر رہے ہیں۔

۵۱ – مطلب یہ ہے کہ اِن کی زیادتیوں پر تم بے صبر نہ ہو۔ اِن کی شامت قریب آ لگی ہے۔ پیمانہ بھرا چاہتا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی مہلت کے کچھ دن باقی ہیں، انھیں پورا ہو لینے دو۔

۵۲ – یعنی سِفارش اسی کے حق میں ہوگی جس نے پروانہ حاصل کیا ہو، اور وہی سفارش کر سکے گا جسے پروانہ ملا ہو۔

شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ

تم لوگ گھڑ لائے ہو۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں، اس بات پر کہ لوگوں نے رحمٰن کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا! رحمٰن کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ زمین اور آسمانوں کے اندر جو بھی ہیں، سب اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ محیط ہے اور اس نے اُن کو شمار کر رکھا ہے۔ سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔

یقیناً جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عملِ صالح کر رہے ہیں، عنقریب رحمٰن اُن کے لیے دلوں میں محبّت پیدا کر دے گا۔[۵۳] پس اے محمدؐ! اِس کلام کو ہم نے آسان کر کے تمھاری زبان میں اسی لیے نازل کیا ہے کہ تم

آیت کے الفاظ ایسے ہیں جو دونوں پہلوؤں پر یکساں روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ بات کہ سِفارش صرف اسی کے حق میں ہو سکے گی جس نے رحمٰن سے پروانہ حاصل کر لیا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے دنیا میں ایمان لا کر اور خدا سے کچھ تعلق جوڑ کر اپنے آپ کو خدا کے عَفو و درگزر کا مستحق بنا لیا ہو۔ اور یہ بات کہ سفارش وہی کر سکے گا جس کو پروانہ ملا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے جن جن کو اپنا شفیع اور سفارشی سمجھ لیا ہے، وہ سفارشیں کرنے کے مجاز نہ ہوں گے، بلکہ خدا خود جس کو اجازت دے گا وہی شَفاعت کے لیے زبان کھول سکے گا۔

۵۳ – یعنی آج مکے کی گلیوں میں وہ ذلیل و رُسوا کیے جا رہے ہیں، مگر یہ حالت دیر پا نہیں ہے۔ قریب ہے وہ وقت جب کہ اپنے اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حَسَنہ کی وجہ سے وہ محبوبِ خلائق ہو کر رہیں گے۔ دل ان کی طرف کھنچیں گے۔ دُنیا ان کے آگے

الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ط هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾ ع
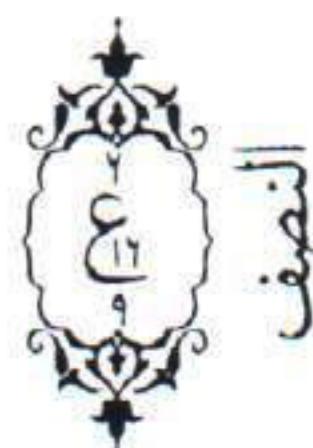
پرہیزگاروں کو خوش خبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو ڈرا دو۔ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، پھر آج کہیں تم ان کا نشان پاتے ہو، یا اُن کی بِھنک بھی کہیں سنائی دیتی ہے؟ ع

پلکیں بچھائے گی۔ فِسق و فُجور، رعونت اور کِبر، جھوٹ اور ریا کاری کے بل پر جو سیادت و قیادت چلتی ہو، وہ گردنوں کو چاہے جھکا لے، دلوں کو مسخّر نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس جو لوگ صداقت، دیانت، اخلاص اور حُسنِ اَخلاق کے ساتھ راہِ راست کی طرف دعوت دیں، ان سے اوّل اوّل چاہے دُنیا کتنی ہی اُپرائے، آخر کار وہ دلوں کو موہ لیتے ہیں اور بد دیانت لوگوں کا جھوٹ زیادہ دیر تک ان کا راستہ روکے نہیں رہ سکتا۔